# اسلام اور آزادرُو جمہوریت: ایک تاریخی جائزہ-۱

برنارڈ لیوس*

ترجمہ و تلخیص: محب الحق صاحبزادہ

اہم مباحث پر اختصار کے ساتھ گفتگو ضروری ہو تو ہمیشہ یہ احتمال رہتا ہے کہ بات کرنے والا بعض الفاظ کے غلط استعمال یا نامناسب تشریح کے سبب بھٹک جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''اسلام'' اور ''آزادرُو جمہوریت'' (liberal democracy) کی اصطلاحات سے میری مراد کیا ہے۔

آج کل جمہوریت کا لفظ بہت کثرت سے اور اکثر و بیشتر غلط مفہوم میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے کئی معانی ہیں اور مختلف مقامات پر اس کی عجیب و غریب شکلیں سامنے آئی ہیں، مثلاً جنرل فرانکو کے سپین میں، کرنیلوں کے یونان میں، جنرلوں کے پاکستان میں، کیساروں (commissars) کے مشرقی یورپ میں۔ اور ہر جگہ اس کے آغاز میں ایک ایسا اسم صفت لگا دیا جاتا ہے مثلاً ''پابند جمہوریت''، ''بنیادی جمہوریت''، ''اساسی جمہوریت'' یا ''مقبول جمہوریت''، جس سے اس کا مفہوم یا تو اصل سے کم رہ جائے یا بدل جائے یا یہ بالکل اس کے برعکس معنی دینے لگے۔

جمہوریت کی ایک تعریف ان افراد نے کی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ خود اسلام ہی واحد مستند جمہوریت ہے۔ یہ بیان بالکل صحیح ہے بشرطیکہ ان کے مفروضہ تصورِ جمہوریت کو بھی درست تسلیم کر لیا جائے۔ چونکہ ان

---

* برنارڈ لیوس ایک یہودی عالم ہیں جو یونیورسٹی آف لندن میں تاریخ کے پروفیسر رہے ہیں اور پرنسٹن یونیورسٹی میں مطالعات مشرق قریب (Near Eastern Studies) کے پروفیسر امریطس ہیں۔ آپ مشرقِ وسطی اور مسلمانوں کی سیاست و تاریخ پر کئی اہم کتب کے مصنف ہیں۔ ان کی یہ دو کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: (۱) *Political Language of Islam* (۱۹۸۸ء)، اور (۲) *The Arabs in History* (۱۹۶۰ء)۔ زیرِ نظر مقالہ انہوں نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو واشنگٹن ڈی سی میں انٹرنیشنل فورم فار ڈیموکریٹک اسٹڈیز میں پیش کیا تھا۔

کا یہ تصور جمہوریت کی اس تعریف پر پورا نہیں اترتا جس پر میں نے اس بحث کی بنیاد رکھی ہے، چنانچہ، موجودہ مقصد سے غیر متعلق ہونے کی بنا پر، فی الوقت اسے زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔

میں جس جمہوریت کی بات کر رہا ہوں وہ مذکورہ بالا جمہوریتوں سے مختلف ہے۔ آزادرَو جمہوریت سے میری مراد حکومتوں کو منتخب کرنے اور برخواست کرنے کا وہ عمومی طریقہ ہے جس نے برطانیہ میں رواج پایا اور پھر ساری انگریزی بولنے والی اقوام اور ان سے باہر کی اقوام میں پھیل گیا۔

۱۹۴۵ء میں، دوسری جنگ عظیم کے فاتحین نے، تین محوری قوتوں پر پارلیمانی جمہوریت مسلط کی۔ تینوں ممالک میں یہ نظام کامیاب رہا، ایک ملک میں ــــ شائد ــــ کچھ عدم تحفظ کا شکار رہا۔ تاہم کسی بھی ملک میں اسے زیادہ بڑا چیلنج پیش نہیں آیا۔ اتحادیوں میں سے جب برطانیہ اور فرانس نے جنگ کے بعد اپنی سابق نوآبادیوں سے پسپائی اختیار کی تو وہاں ــــ کامیابی کی مختلف شرحوں کے ساتھ ــــ اپنے اپنے انداز کی جمہوریتوں کا ورثہ چھوڑا۔

یہ دیکھنے اور جانچنے کے لیے کہ میں جس جمہوریت کی بات کر رہا ہوں، وہ کسی جگہ واقعی موجود ہے یا نہیں، بہترین پیمانہ سیموئیل ہنٹنگٹن کی یہ مستند رائے ہے کہ کسی ملک کو جمہوری تب کہا جائے گا اگر وہاں مسلسل دو بار آزادانہ انتخابات کے ذریعہ پرامن انتقال اقتدار عمل میں آیا ہو۔ دو انتخابات کی شرط لگا کر ہنٹنگٹن نے ان حکومتوں کو اس فہرست سے خارج کر دیا ہے جو ایک تیز نظر مبصر کے الفاظ میں: ''ایک فرد، ایک ووٹ، ایک بار'' کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ لہذا میرے نزدیک جمہوریت وہ طرز سیاست ہے جہاں حکومت کو انتخابات کے ذریعے تبدیل کیا جا سکتا ہو نہ کہ جہاں خود حکومت انتخابات [کے نتائج] کو تبدیل کر دے۔

امریکیوں کا رجحان یہ ہے کہ وہ جمہوریت اور بادشاہت کو متضاد اصطلاحیں سمجھتے ہیں۔ البتہ یورپ میں جمہوریاؤں (republics) کی بہ نسبت آئینی بادشاہتوں میں جمہوریت زیادہ بہتر کام کرتی رہی ہے۔ یہ امر کافی سبق آموز اور معلومات افزا ثابت ہو سکتا ہے کہ ہم ان یورپی ممالک کی فہرست مرتب کر دیں جہاں جمہوریت تدریجاً پروان چڑھی، طویل عرصے تک اس میں خلل نہیں پڑا، اور جہاں قوی امکان ہے کہ پیش نظر مستقبل میں یہ طرز حکومت جاری رہے گا۔ یہ مجوزہ فہرست مختصر ہے اور ایک کے سوا ہر جگہ

بادشاہت ہے۔ یہ استثنائی مثال سوئزرلینڈ کی ہے جو امریکہ کی طرح مخصوص صورت حال کی وجہ سے ایک منفرد معاملہ ہے۔ فرانسیسی جمہوریہ میں، جو دو سو برس پہلے انقلاب کے نتیجہ میں وجود میں آئی، جمہوریت کو وقتاً فوقتاً رکاوٹوں، حالت سابقہ کی طرف رجعت اور گریز و انحراف کا سامنا رہا۔ یورپ کی اکثر دیگر جمہوریتوں میں، اور اسی طرح باقی ساری دنیا میں بھی، جمہوریت کی صورت حال بے مثل طور پر ابتر رہی۔

اس ساری صورت حال سے مشرق وسطیٰ کے لیے کچھ سبق حاصل ہو سکتے ہیں، جہاں بادشاہی کا اصول حکمرانی اب بھی مضبوط ہے۔ مشرق وسطیٰ کی ریاستوں میں سب سے زیادہ خالص عرب اور مسلمان مملکت سعودی عرب کی ہے، جو اپنے نام اور پہچان کا انتساب ہی اس حکمران شاہی خاندان کی طرف کرتی ہے جس نے اس کی بنیادیں رکھیں۔

یہی معاملہ عثمانی خلافت کا تھا جو اسلامی سلطنتوں میں سب سے جدید اور بے حد پائیدار سلطنت تھی۔ یہاں تک کہ شام کے حافظ الاسد اور عراق کے صدام حسین جیسے انقلابی لیڈر اپنے بیٹوں کو محفوظ طور پر وراثت حکمرانی منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ایسے سیاسی کلچر میں جہاں خاندانی حکمرانی کا رنگ اتنا غالب ہے، جمہوریت اگر اس کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کے ہم رکاب چلے تو بعض ممالک میں یہ اچھے نتائج دے سکتی ہے۔

دوسری اصطلاح ''اسلام'' سے ہماری کیا مراد ہے؟ اس کے بھی کئی معانی ہیں۔ ایک معانی میں اسلام ایک مذہب ہے ـــــ عقائد، عبادات، نظریہ، معیارات اور تصورات کا ایک نظام ـــــ جس کا تعلق توحیدی مذاہب کے خاندان سے ہے، یعنی یہودیت اور نصرانیت کی طرح کا مذہب جو وحی والہام پر مبنی ہیں۔ دوسرے معانی میں اس سے مراد وہ پوری تہذیب ہے جو اس مذہب [دین] کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ اسی طرح جیسے کبھی 'عیسائی دنیا' (Christendon) کی اصطلاح عام تھی۔

مغرب میں جب ہم عیسائی آرٹ کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب نذر یا منت وغیرہ کے حوالے سے مذہبی اختیاری آرٹ (votive art) ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اسلامی آرٹ کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی فن جو مسلمانوں نے، یا بلکہ کسی غیر مسلم نے بھی، اسلامی تہذیب وتمدن کے اندر پروان چڑھایا ہو۔ اسی لیے ہم آج بھی اسلامی فلکیات، اسلامی کیمیا اور اسلامی علم ریاضی کا ذکر کر سکتے ہیں

اوراس سے ہماری مراد وہ فلکیات، کیمیا یا علم ریاضی ہیں جنہوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کے زیر سایہ نشوونما پائی۔اس کے مقابل کسی ''عیسائی'' فلکیات، کیمیا یا ریاضی کا وجود نہیں۔

یہ ہر دو اصطلاحات ـــــ اسلام بہ حیثیت دین اور اسلام بہ حیثیت تہذیب ـــــ آگے مزید متنوع صورتیں رکھتی ہیں۔اگر ہم اسلام کا بہ حیثیت ایک تاریخی عمل تذکرہ کریں تو ہم ایک ایسے انسانی گروہ [امت] کی بات کرتے ہیں جس کی افرادی قوت ایک ارب سے زیادہ ہے، جن کی اکثریت مراکش سے منڈاناؤ تک تقریباً دس ہزار میل کے وسیع وعریض قوس پر پھیلی ہوئی ہے، جس کی چودہ صدیوں پر محیط تاریخ ہے اور یہی [اسلام] اسلامی کانفرنس تنظیم میں شامل تمام ریاستوں کی بنیادی شناخت ہے۔بدیہی طور پر یہ امر بے حد مشکل ہے (اگرچہ ناممکن نہیں) کہ اتنی طویل تاریخ، اتنے بڑے حجم اور اتنی پیچیدگی کے ہوتے ہوئے اس کے متعلق کوئی مناسب عمومی حکم لگایا جاسکے۔

اگر ہم اسلام بہ طور دین تک ہی اپنی بحث محدود رکھیں تب بھی واضح امتیازات قائم کرنے پڑیں گے۔سب سے پہلے وہ اسلام ہے جسے خود مسلمان قرآن وحدیث پر مبنی قدیم، حقیقی اور خالص دین سمجھتے ہیں، جس میں بعد کی نسلوں میں آمیزش ہوئی۔پھر علمائے شریعت کا اسلام ہے جو کلاسیکی اسلامی فقہ اور دینیات کا عظیم الشان حکیمانہ مجموعہ ہے۔حال ہی میں اسلام کی ایک نئی شکل، نام نہاد بنیاد پرستوں نے متعارف کرائی ہے جو قرآن، حدیث اور کلاسیکی نظریہ ایمان کے لیے بہ یک وقت اجنبی تصورات پر مشتمل ہے [کذا]۔

واضح طور پر اسلام کی یہ آخری شکل آزادرُو جمہوریت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور خود بنیاد پرست سب سے پہلے یہی بات کہیں گے۔وہ آزادرُو جمہوریت کو حقارت کے ساتھ، بگڑا ہوا اور بگاڑ دینے والا نظام حکومت تصور کرتے ہیں۔وہ اسے زیادہ سے زیادہ اسی حد تک برداشت کرتے ہیں کہ یہ اقتدار تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے، اور وہ بھی صرف یک طرفہ راستہ۔

## تاریخ اور روایت

اسلام پر دو اور پہلوؤں سے بھی بات کی جاسکتی ہے۔ایک تاریخی حوالے سے اور دوسرے ایک

ایسے نظام کے طور پر جو تصورات، اعمال اور ثقافتی خصائص کا ایک مجموعہ ہے۔

اسلام کے تاریخی ریکارڈ پر پہلی نظر حوصلہ افزا نہیں۔ اکثریتی مسلم خطوں میں فعال جمہوریتیں بہت ہی کم ہیں۔ اسلامی کانفرنس کے ۵۳ [اب ۵۶] رکن ممالک میں سے صرف ایک ملک ترکی، ہنٹنگٹن کے جمہوری پیمانے پر پورا اترتا ہے اور یہاں بھی کئی حوالوں سے جمہوریت اضطراب کا شکار ہے۔ باقی ممالک میں جمہوری تحریکیں نظر آتی ہیں اور بعض جگہوں پر امید افزا پیش قدمی بھی ہے لیکن کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں اس کم از کم سطح ہی کی جمہوریت موجود ہے، جیسی ہمیں آج ترکی میں نظر آتی ہے۔

تاریخی طور پر پوری اسلامی دنیا میں زیادہ تر مطلق العنان شخصی حکومتیں (autocracy) رہی ہیں۔ لیکن انہیں جابرانہ آمریت (despotism) کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اسلامی تاریخ میں غالب سیاسی روایت حکم اور اطاعت پر مبنی رہی ہے۔ دور جدید نے اس روایت کو کمزور نہیں کیا بلکہ اس میں مزید مضبوطی پیدا ہوئی ہے۔ شخصی حکومتوں پر روایتی بندشوں کی کمزوری کے ساتھ، اور جاسوسی، دباؤ اور دولت کمانے کے ان نت نئے ہتھکنڈوں کے رواج پانے سے جو حکمرانوں کو جدید ٹیکنالوجی اور طور طریقوں کی بدولت حاصل ہیں، حکومتوں کا انحصار عوامی خوشنودی پر پہلے کے مقابلے میں بہت کم رہ گیا ہے۔ یہ بات خاص طور پر ان حکومتوں کے ضمن میں بالکل صحیح ہے جنہیں تیل کی آمدنیوں نے مالا مال کر دیا ہے۔ چونکہ ٹیکس لگانے کی ضرورت نہیں اس لیے [عوامی] نمائندگی کے لیے مطالبے اور دباؤ بھی نہیں۔

ایک اور قابل غور تاریخی اور ثقافتی حقیقت [اسلامی دنیا میں] شہریت کے تصور کا فقدان ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں انگریزی لفظ "CITIZEN" (شہری) کا مترادف لفظ ہی موجود نہیں۔ ان تینوں زبانوں میں اس کے لیے جو ملتی جلتی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اس کا مطلب صرف ''ہم وطن'' یا ''دیس کا باسی'' بنتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی انگریزی لفظ citizen کا مفہوم نہیں دیتا، جو لاطینی ''سوس'' (civis) سے ماخوذ ہے، جس کا جزو یونانی شائستہ اطواری ہے اور سیاسی معنوں میں اس کا مطلب ہے وہ شخص یا گروہ جو شہری مملکت (polis) کے معاملات میں شرکت کرے۔ عربی یا باقی مذکورہ زبانوں میں ایسا کوئی لفظ اس لیے نہیں ہے کیونکہ خود ''شہری بہ طور امور مملکت میں شراکت دار'' یا ''شہریت بہ شکل شراکت'' کا تصور ہی وہاں موجود نہیں۔

تاہم یہ ممکن ہے کہ ہم اسلامی شریعت اور روایت میں موجود ان عناصر کا ادراک حاصل کریں جو کسی نہ کسی رنگ کی جمہوریت پروان چڑھانے میں مددگار ہوں۔ اسلام اپنے قیمتی سیاسی لٹریچر پر فخر کرتا ہے۔ بالکل ابتدائی دور سے، شریعت کے ماہرین، فلاسفہ، ائمہ اور دوسرے حکماء، بڑی احتیاط سے سیاسی قوت کا انداز و مزاج، اقتدار کے حصول، اس کے استعمال بلکہ اس کے خاتمہ کے طریقے اور وسائل، اس کے ساتھ ساتھ حاکموں کے فرائض و واجبات، نیز ان کے حقوق و مراعات، بیان کرتے رہے ہیں۔

اسلامی روایت بڑی سختی سے من مانی حکمرانی کو رد کرتی ہے۔ روایتی اسلامی دنیا میں اقتدار کا مرکزی ادارہ ''خلافت'' ہے جس کی حیثیت ائمہ اہل السنہ کے نزدیک معاہداتی اور شورائی ہے۔ یہ خصوصیات خلفاء کو مطلق العنان آمروں سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ سیاسی قوت کے استعمال کو ایک ''معاہدہ'' کے طور پر سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں راعی اور رعیت کے درمیان باہمی حقوق و فرائض کے رشتے قائم ہوتے ہیں۔ رعایا کا فرض ہوتا ہے کہ حکمران کی اطاعت کرے اور اس کے احکامات بجا لائے۔ اسی طرح حکمران پر بھی رعایا کے حقوق ہوتے ہیں ایسے ہی جیسے اکثر دوسری ثقافتوں میں مقرر ہیں۔

اگر حکمران عہد کی پابندی میں ناکام رہے یا کسی وجہ سے عہد پورا کرنے کے قابل نہ رہے تو مذکورہ معاہدہ کالعدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خال خال لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں جب یہ معاہدے اس طرح منسوخ کیے گئے۔ اس لیے روایتی اسلامی تصور حکومت میں [عوامی] ''مرضی'' کا عنصر بھی موجود ہے۔

بہت سی احادیث میں اطاعت امیر کو لازمی بتایا گیا ہے، جبکہ بعض روایات میں استثنا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں''۔ دوسرے الفاظ میں کسی انسان کا وہ حکم نہ مانا جائے جس سے خدائی قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ اسی طرح کی دوسری حدیث میں ہے: ''گناہ میں اطاعت لازم نہیں''۔ یعنی حکمران کسی گناہ کا حکم دے تو اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس طرح کے احکامات نبوی [صلی اللہ علیہ وسلم] نہ صرف حکم عدولی کا حق دیتے ہیں (جیسا کہ مغربی تصور سیاست میں ہے) بلکہ ایسی حکم عدولی گویا شرعی حکم اور لزوم کا درجہ رکھتی ہے۔

ہم جب اصولوں سے قطع نظر حقائق کی دنیا میں آتے ہیں، تب کہانی میں یقیناً بہت سے نشیب و فراز ہیں۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں وہ عناصر موجود ہیں جو جمہوری

اداروں کی ترکیب وتشکیل کے حق میں ہیں۔

رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] کی طرف منسوب ایک روایت ہے کہ: ''میری امت کا اختلاف اللہ کی رحمت کی نشانی ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اختلاف رائے کو دبانے کی بجائے خوش آمدید کہنا چاہیے۔ اس طرز عمل کی واضح مثال یہ ہے کہ آج بھی اہل السنۃ مسلمان اسلامی فقہ کے چار مختلف مسالک کو تسلیم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ شریعت کا نزول اور ہدایت الہامی ہے، اس کے باوجود قانون کے حوالہ سے چار واضح طور پر مختلف مسالک موجود ہیں۔ یہ تصور کہ اختلاف رائے کے باوجود ہر گروہ اور فرد راسخ العقیدہ رہ سکتا ہے، ایک ایسے اصول کو جنم دیتا ہے جس کے تحت کثرت آراء اور ان کے ضمن میں باہمی برداشت منظور ومقبول ہے۔ اور یہ امر پارلیمانی طرز حکومت کے لیے چنداں بُرا نہیں۔

اس فہرست [بحث] میں آخری قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اسلام وقار اور انکساری پر بہ یک وقت زور دیتا ہے۔ رعیت ــــ کمترین درجہ کی رعیت بھی ــــ روایتی اسلامی تصور کے تحت، عزت نفس کا استحقاق رکھتی ہے اور [حکم ہے] کہ حکمران تکبر، رعونت اور خود پسندی سے اجتناب کریں۔ عثمانی دور میں روایت تھی کہ جب سلطان متبرک دنوں میں مملکت کی اہم شخصیتوں کا استقبال کرتا تو قانون کے احترام میں کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ جب نیا خلیفہ تخت نشین ہوتا تو اس کو تبریک یوں پیش کی جاتی: ''سلطان! تکبر نہ کرنا، کہ اللہ تجھ سے بڑا ہے''۔

لیکن آزادی کا تصور ــــ جس کا مطلب حکومت کی تشکیل، اس کے کاروبار اور قانونی برخواستگی یا تشکیل نو جیسے امور میں شرکت کی اہلیت ہو ــــ اجنبی ہی رہا۔ یہ تصور جو دستوری اور پارلیمانی نظام کی حقیقی منطق کا حصہ ہے، قدرتی طور پر شخصی بادشاہتوں کے لیے ناگوار اور تکلیف دہ ہے۔ وہ اسے بہ مشکل ہی قبول کریں گی اور اپنے حال پر باقی رہنا چاہیں گی۔ چنانچہ اصل سوال یہ تھا کہ کیا دساتیر، انتخابات اور پارلیمان ــــ کہ جمہوریت کا اداراتی سنگھار ہیں ــــ بس ویسے ہی [نمائشی] رہیں گے، یا ان کی حیثیت حقیقتاً ایسے ذرائع کی ہوگی جنہیں استعمال میں لا کر عوام کو بھی اپنی حکومت کے ضمن میں کچھ کہنے کا موقع مل سکے گا۔

اسلامی دنیا میں پارلیمنٹ کی تشکیل کے لیے پہلے سنجیدہ انتخابات کا انعقاد ۱۸۷۶ء کے عثمانی دستور

کے تحت ہوا۔ بے شک اصل مقصد ایک تابع فرمان پارلیمنٹ کا وجود تھا، جو سلطانی اختیار و اقتدار کے لیے نمائشی توثیق کا وسیلہ بنتی۔ لیکن اس پارلیمنٹ کے ارکان (deputies) نے جلد ہی اپنا ایک ذہن بنا لیا۔ ۱۳ فروری ۱۸۷۸ء کو یہ ارکان یہ مطالبہ تک کر بیٹھے کہ تین وزراء جن کے خلاف خصوصی الزامات سامنے آئے تھے، پارلیمنٹ میں اپنے دفاع کے لیے پیش ہوں۔ جواب میں سلطان نے اگلے ہی روز پارلیمنٹ توڑ دی اور ارکان کو گھر بھجوا دیا۔ پھر اس پارلیمنٹ کا اجلاس ۱۹۰۸ء کے نوجوان ترک انقلاب کے ایک سال بعد تک منعقد نہ ہو پایا۔ یہ وقفہ بھی مختصر ثابت ہوا اور فوجی انقلاب نے مختصر پارلیمانی حکمرانی کے ہنگامہ خیز دور کا خاتمہ کر دیا۔

تب سے پارلیمانی نظم حکومت کا حال بالخصوص اسلامی دنیا میں کچھ اچھا نہیں رہا۔ اکثر یہاں انتخابات کسی حکومت کی تشکیل کے لیے نہیں بلکہ ایک رسم کے طور پر ہوتے ہیں۔ دکھاوے کا یہ سارا عمل دوسرے ذرائع سے نافذ شدہ فیصلے کی توثیق اور چناؤ کی علامت کے طور پر ہوتا ہے، جیسے امریکہ میں صدارتی افتتاحی تقریب ہوتی ہے یا برطانیہ میں رسم تاجپوشی۔ البتہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ چند وقفے اور بعض صورتیں ایسی ہیں جہاں انتخابات [ بہر حال ] کچھ نہ کچھ معانی رکھتے ہیں۔ انیسویں سے بیسویں صدی تک آتے آتے مخالف سمت میں کئی ڈرامائی پیش قدمیوں کے باوجود (یا شائد انہی کے سبب) ریکارڈ پر ایسی مثالیں زیادہ عام ہوتی جاتی ہیں۔

## حکومتوں کی ایک نامکمل درجہ بندی

سامراجی ورثہ ایک اور پیچیدگی ہے جو اسلامی دنیا میں لفظ ''آزادی'' کے درست فہم کو مشکل بناتی ہے۔ جب بیشتر (اگرچہ تمام نہیں) اسلامی دنیا پر بیرونی حکمران تھے تو آزادی کا مطلب سماجی یا قومی آزادی سمجھا گیا۔ ہیئت سیاسی میں کسی فرد کے مقام و مرتبہ کا یہاں کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔

آج اسلامی دنیا کے بیشتر ممالک اغیار کے تسلط سے آزاد ہیں، لیکن انہیں اندرونی آزادی میسر نہیں۔ انہیں اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، لیکن جمہوریت کا فقدان ہے۔ محرومی میں اس یکسانیت کے باوجود ان میں باہمی فرق و امتیاز کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر مسلمان معاشروں میں (ترکی کے استثنا کا ذکر ہو

چکا) کئی طرح کی شخصی، جابرانہ، مطلق العنان، غاصب اور ہمہ گیر یک حزبی حکومتیں ہیں۔ ایک ادھوری سی فہرست مرتب کریں تو اسلامی دنیا میں پانچ طرح کی حکومتیں یا ریاستیں ہیں:

اول، روایتی بادشاہتیں۔ یہ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کی طرح کے ممالک ہیں جہاں خاندانی بادشاہتوں کا مدار روایتی رسوم و رواج، اور تاریخ پر ہے۔ یہ حکومتیں اپنے مزاج میں کلیتہً جابرانہ ہیں۔ لیکن وہی روایات جو انہیں سہارا دیتی ہیں انہیں متحد بھی رکھتی ہیں۔ ان کا جواز بہت حد تک [عوامی] قبولیت پر ہے۔ اگر کھلی زبردستی اور ضرورت سے زائد دباؤ سے کام لیا گیا تو یہ اعتماد ٹوٹ پھوٹ بھی سکتا ہے۔ آج کے حکمران ایسے نہیں رہے جیسے کبھی تھے کیونکہ نئے تصورات اور نئی قوتوں کے زیر اثر بہت کچھ نابود ہو چکا ہے۔ اب حکمران اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لیے نئے طور طریقے اختیار کرتے ہیں، لیکن وہی طریقے ــــ خصوصاً جدید برقیاتی ذرائع ابلاغ ــــ دوسروں کی دسترس میں بھی ہیں، جو رائج نظام کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔

ایرانی انقلاب، جس نے ۱۹۷۹ء میں شاہ کا تختہ الٹا، تاریخ کا پہلا برقیاتی (electronic) انقلاب تھا۔ یہ انقلاب آخری نہیں ہوگا۔ ایران میں رہتے ہوئے خمینی کچھ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی قریبی عراق سے کچھ کرنا اس کے بس میں تھا۔ لیکن جب وہ پیرس گیا اور کیسٹ ریکارڈ کر کے یا براہ راست فون کالوں سے، جس کا نظام خود شاہ نے قائم کیا تھا، اس نے ایران کو مخاطب کیا، تو سامعین کے وسیع حلقہ تک پہنچ گیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ سیٹلائیٹ ٹی وی، فیکس مشین اور برقیاتی ڈاک سے تخریب کاری کا پیغام ایسے پہنچایا جا سکتا ہے جسے روکنا اور کنٹرول کرنا مشکل ہے۔ شاہ ایران کے خلاف اسلامی انقلابیوں نے جو طریقے استعمال کیے، وہ اب خود اسلامی جمہوریہ ایران کے خلاف ــــ زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ شکلوں میں ــــ استعمال ہو رہے ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ناراض لسانی، مذہبی، نظریاتی گروہ حکمرانوں کے خلاف انہی وسائل سے کام لے رہے ہیں۔

دوم، طرز جدید کی شخصی حکومتیں۔ یہ وہ حکومتیں ہیں ــــ مثلاً اردن، مصر اور مراکش ــــ جن کی جڑیں تو روایتی بادشاہتوں میں ہیں لیکن جہاں جدیدیت اور جمہوری انداز حکومت کی طرف قابل ذکر پیش رفت ہو رہی ہے۔ آزاد رو جمہوریت کی مذکورہ بالا تعریف پر تو ایک بھی حکومت پوری نہیں اترتی، لیکن کسی جگہ

کامل شخصی حکومت بھی نہیں۔ تینوں ملکوں میں زیادہ سے زیادہ آزادی کی طرف پیش قدمی ہو رہی ہے۔ مشکلات، رکاوٹیں اور مسائل بھی ہیں، تاہم تبدیلی کی بنیادی سمت واضح ہے۔

سوم، فاشسٹ انداز کی آمریتیں۔ یہ بالخصوص شام کے حافظ الاسد اور عراق کے صدام حسین کی یعنی یک حزبی حکومتیں ہیں جو یورپی فاشزم کے انداز میں تشکیل دی گئی ہیں۔ اپنے قانونی تصورات، عمل درآمد اور سٹائل میں یہ [اٹلی کے] مسولینی کا بڑی حد تک اور کچھ حد تک [جرمنی کے] ایڈولف ہٹلر کی مثالوں کا اتباع کرتی ہیں۔

چہارم، انتہا پسند انقلابی اسلامی حکومتیں۔ اس ضمرے میں فی الوقت دو حکومتیں آتی ہیں، یعنی ایران اور سوڈان۔ شاید کچھ اور بھی ان کے پیچھے چلیں، مثلاً افغانستان* یا الجزائر۔ اگرچہ دوسرا امکان بڑھنے کی بجائے ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مصر میں ایک طاقت ور انقلابی اسلامی تحریک موجود ہے، لیکن مصری سیاسی ہیئت مقتدرہ میں اپنے آپ کو اقتدار پر مسلط رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ مزید براں عالمی اسلامی انقلابیت کی طرف سے خود مختار ریاست کو درپیش خطرہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ خمینی کہا کرتے تھے کہ اسلام میں کوئی [جغرافیائی] حد بندیاں نہیں ہوتیں، لیکن پھر انہوں نے خود ملکی دستور میں یہ شق رکھوائی کہ اسلامی جمہوریہ ایران کا صدر اپنی اصل اور پیدائش کے اعتبار سے لازماً ایرانی ہونا چاہیے۔ خمینی کے اپنے طرز عمل میں ـــ ان کے جانشینوں کی بات تو جانے دیجیے ـــ ایرانی عنصر کو اولیت حاصل رہی۔ باقی ممالک میں بھی، جہاں حد درجہ انتہا پسند اسلامی گروہ موجود ہیں، یہی رجحان ہے کہ کسی بڑے کل [پین اسلامزم] میں اپنی قومی اور علاقائی شناخت گم کرنے پر کوئی بھی آمادہ نہیں۔

پنجم، وسط ایشیائی جمہوریتیں۔ ممالک کا یہ آخری گروہ، جن کی درجہ بندی طرز حکمرانی سے نہیں بلکہ تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ آسان ہے، وہ چھ سابق سوویت جمہوریتیں ہیں جہاں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ میں [مصنف] ان ممالک میں حکومتوں کی خصوصیات متعین کرنے سے قاصر ہوں۔ بس اتنا کہوں گا کہ انہیں بھی اپنے سابق سامراجی آقاؤں سے آزادی کے بعد وہی مسائل درپیش ہیں جیسے اس [بیسویں] صدی کی ابتدا میں مصریوں، شمالی افریقیوں، شامیوں اور عراقیوں کو اپنے اپنے سابق آقاؤں کے ضمن میں

---

* اکتوبر ۱۹۹۵ء کے تناظر میں امکان ظاہر کیا جا رہا تھا [مترجم]۔

درپیش تھے۔ رسمی طور پر آزادی تسلیم ہوتے ہی، مابعد سامراج تعطل کا دور شروع ہو جاتا ہے جس میں دخل اندازی ہوتی ہے اور غیر مساویانہ اور توہین آمیز معاہدات، مراعات وغیرہ کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ ایک بڑا فرق اب کے یہ ہے کہ نو آزاد اقوام کا واسطہ لندن یا پیرس سے نہیں بلکہ ماسکو سے ہے۔ یوں نتائج بھی کافی مختلف سامنے آسکتے ہیں*۔

## مشرق وسطٰی سے باہر کے مسلمان

کروڑوں مسلمان جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں بستے ہیں لیکن وقت کی قلت اور ان ممالک کے متعلق نسبتاً میری لاعلمی کا تقاضا ہے کہ وہاں کی صورت حال کا مختصر اور سرسری ذکر کروں۔ پاکستان، بنگلہ دیش، ملائیشیا اور انڈونیشیا، سبھی شام اور عراق کی بہ نسبت مصر اور مراکش سے زیادہ ملتے جلتے ممالک ہیں، اور یہی بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ میں اگر یہ کہتا ہوں کہ جنوبی ایشیا کے یہ ممالک مشرق وسطٰی یا شمالی افریقی ممالک سے ملتے جلتے ہیں (اور اس کے برعکس نہیں کہتا) تو اس کی ایک وجہ ہے۔ مثلاً صرف انڈونیشیا میں پوری عرب دنیا سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ اس کے باوجود ثانی الذکر اول الذکر کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اسلام کے تاریخی، جغرافیائی مرکز کو اسلامی دنیا پر جو رسوخ حاصل ہے، وہ ان سے دور پار بسنے والے ملکوں کو شاید ہی کبھی حاصل ہو۔ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیائی مسلم ممالک کی غالب ترین آبادی اور خود مغرب کے اندر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تحت شاید یہ صورت حال بھی تبدیل ہو جائے۔

مسلمانوں کا ایک نسبتاً چھوٹا گروہ، جس کی اہمیت شاید زیادہ شدت سے محسوس کی جانے لگے، اسلام سے وابستہ ان لوگوں کا ہے جو نقل مکانی کر کے مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں جا بسے ہیں۔ یہ گروہ بے حد اہم ہیں، اس لیے نہیں کہ ان کے رہائشی ممالک میں کیا واقعات پیش آرہے ہیں بلکہ ان کی اہمیت ان اثرات کی وجہ سے ہے جو یہ اپنے آبائی ممالک پر ڈال سکتے ہیں۔ مسلم اقلیتوں کے طور پر دنیا میں یقیناً ان کی تعداد بہت کم ہے، تاہم بھارت کی مسلم اقلیت (کل آبادی کا ۱۱ فیصد) کسی غیر مسلم حکومت میں

---

*یاد رہے کہ یہ تحریر ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء کی ایک تقریر پر مبنی ہے جب وسط ایشیائی ریاستوں کے متعلق صورت حال اس قدر واضح نہ تھی اور ہر طرح کے خدشات ظاہر کیے جا رہے تھے [مترجم]۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہے۔ سچ یہ ہے کہ صرف دو دوسرے ممالک (انڈونیشیا اور بنگلہ دیش) میں مسلمانوں کی تعداد [بھارت سے] زیادہ ہے۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے اندر ایک قابل لحاظ مسلم اقلیت آباد ہے۔ ایتھوپیا میں بھی ـــــ جو ایک عیسائی ملک ہے اور جہاں کا چرچ اپنا رشتہ مسیح [علیہ السلام] کے حواریوں کے ساتھ جوڑتا ہے ـــــ کافی تعداد میں مسلمان اقلیت کے طور پر رہتے ہیں۔ تحتِ صحارا (Sub-Saharan) افریقہ کے بہت سے ملکوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، یا کافی بڑی اقلیت ہیں۔

یورپ اور بلقان کی ریاستوں میں، قدیم مسلمان اقلیتیں آباد ہیں۔ سب سے زیادہ خود روسی فیڈریشن میں کم وبیش ۱۵ فیصد مسلمان بستے ہیں۔

جس طرح ستر کی دہائی میں خمینی نے ایران بدر کمیونٹی کے درمیان رہ کر کام کیا، بعض سیاسی گروہ جو یورپ اور شمالی امریکہ کے نئے مسلمان معاشروں میں گھوم پھر رہے ہیں، اپنے اپنے ممالک میں صاحبانِ اقتدار کے خلاف معاونت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً ترک کردوں کی علیحدگی پسند تحریک، جرمنی میں کرد آبادی کے اندر بہت فعال ہے۔ شمالی افریقہ کی اسلامی بنیاد پرست تحریک فرانس میں مالی معاونت حاصل کرتی، ہتھیار خریدتی اور اپنی تنظیم سازی کرتی ہے۔ مختلف تحریکیں اسی انداز میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو استعمال کر رہی ہیں۔

یاد رہے کہ مغربی یورپ اور شمالی امریکہ میں جا بسنے والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو انتہا پسندی یا انقلابی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کے برعکس، اپنے آبائی ممالک سے رابطہ میں رہنے کے باوجود یہ مسلمان اپنے نئے اختیار کردہ معاشروں کے ہاں جمہوری عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور بعض اوقات بہ حیثیت شہری کے ایسا کرتے ہیں۔ جمہوری تجربے کے نتیجے میں ان کا جو نقطۂ نظر تشکیل پائے گا وہ اسلامی دنیا کی مستقبل کی سیاسی صورت گری میں سب سے اہم عامل ثابت ہو سکتا ہے۔

## مذہب اور ریاست

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے، اسلام میں روزِ اول سے یہ تشریح موجود ہے کہ مذہبی عقیدہ اور قوت، یا دین اور مملکت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] محض پیغمبر نہ تھے بلکہ ایک حکمران

بھی تھے۔اس حوالے سے اسلام عہدنامہ عتیق کی یہودیت سے مشابہ،اور عیسائیت سے بہت کچھ مختلف لگتا ہے۔عیسائیت صدیوں سرکاری طور پر ایذارسانی اور عقوبت کا شکار رہی ہے۔حتیٰ کہ چوتھی صدی میں جب بادشاہ کانسٹنٹائن کے تحت اسے رومی سلطنت کے سرکاری مذہب کا درجہ ملا،تب بھی مادی اور روحانی قوتوں کا فرق و امتیاز قائم رکھا گیا۔اسی وقت سے،بلااستثناہر عیسائی مملکت نے تخت اور قربان گاہ میں،اور چرچ اور ریاست میں فرق کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ان دو قوتوں میں قریبی تعلق بھی ہوسکتا تھا جیسے بازنطینی سلطنت میں قیصر اور پاپائیت کے درمیان تھا،یا پھر انہیں علیحدہ بھی رکھا جاسکتا تھا۔یہ مل کر اتحاد و اتفاق سے بھی کام کرسکتی تھیں اور ان میں ٹکراؤ بھی ممکن تھا۔کچھ وقت کے لیے ایک غالب آسکتی تھی یا دوسری اس کی جگہ لے سکتی تھی۔[جو بھی صورت ہو] ثنویت برقرار رہی،ایسے ہی جیسے عیسائی روم میں شاہی اقتدار (imperium) اور پاپائی اقتدار (sacerdotium) کے درمیان امتیاز قائم رہا۔

اپنی کلاسیکی شکل میں اسلام کا کوئی تنظیمی مماثل موجود نہیں۔یہاں عیسائیت کا سا کوئی مذہبی طبقہ یا پروہتائی گروہ نہیں،نہ کوئی کلیسائی تنظیم ہے۔مسجد صرف [عبادت کے لیے مخصوص] عمارت ہے،چرچ کی طرح کا ادارہ نہیں۔کم ازکم زمانۂ حال میں اس وقت تک ایسا ہی تھا جب خمینی نے اپنے اقتدار میں ایرانی اسلامی اداروں کو عیسائی رنگ دے دیا اور خود کو پوپ کی طرح معصوم عن الخطا قرار دیا۔پھر آرک بشپ، بشپ اور پادری کی طرح کا مماثل عملی نظام قائم کیا۔یہ سب کچھ اسلامی روایت کے لیے قطعی اجنبی تھا۔اس کا مطلب ایک طرح سے ایک ایسا ''اسلامی انقلاب'' ہوا جو اس انقلاب سے قطعاً مختلف تھا جس کی نشان دہی خمینی کی میراث کے حوالوں سے ہوتی ہے۔

اسلامی تہذیب نے ریاست،اس کے اختیار و اقتدار اور اس کے کردار اور معاملات کے ہر پہلو پر دینیاتی،فلسفیانہ اور فقہی لٹریچر کا بیش بہا ذخیرہ تیار کیا ہے۔البتہ جس پہلو پر زیادہ بحث نہیں کی گئی وہ دینی اور دنیوی قوتوں کا فرق ہے۔لادین (secular) اور لادینیت (secularism) کے لیے جدید اسلامی زبانوں میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ یا تو مستعار لیے ہوئے ہیں یا نو ساختہ ہیں۔اب بھی عامی (layman) اور دنیادار (laity) کا [مناسب] مترادف موجود نہیں۔فقہا اور دیگر مسلم مصنفین نے سیاست پر لکھتے ہوئے [اگرچہ] ہمیشہ مملکت اور دین اور دنیوی اور اخروی امور کے فرق کو تسلیم کیا ہے،لیکن

اس سے وہ فرعی تقسیم اور تفریق (dichotomy) واضح نہیں ہوتی جو مثلاً مغربی اصطلاحوں ـــ ''روحانی اور دنیاوی'' (spiritual and temporal) یا ''عامی اور مذہبی'' (lay and ecclesiastical) ـــ میں موجود ہے۔ عقلی اور تصوراتی حوالے سے [اسلام میں] اس تقسیم کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ سوال تو اب آ کر اٹھا ہے۔ ممکن ہے اس ''عیسائی مرض'' کے لاحق ہونے پر مسلمان اس کا علاج بھی اسی طرح کریں جس طرح عیسائیوں نے کیا ہے ـــ یعنی دین اور دنیا کی تفریق کو تسلیم کر لیں۔

لاریب، میں یہ بات بہ خوبی جانتا ہوں کہ اصلاحِ کلیسا (Reformation) عیسائی دنیا کے ارتقاء کا ایک مرحلہ تھا، اور عقلیت پسندی یا روشن خیالی کی تحریک (Enlightenment) خالصتاً یورپی تاریخ کا ایک دور تھا۔ چنانچہ میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا کہ مغرب کے ماضی کی اسلام کے مستقبل میں کوئی پیوند کاری کی جائے۔ کسی بھی طرح کوئی وجہ نہیں بنتی کہ مسلمانوں سے ٹھیک یہی رویہ اپنانے اور یہی راستہ اختیار کرنے کی توقع کی جائے [جو عیسائی دنیا نے اپنے مسائل سے نکلنے کے لیے اختیار کیا]۔ اگر انہیں چیلنج کا سامنا کرنا ہے تو انہیں مسئلہ کا مخصوص حل خود تجویز کرنا ہوگا۔ البتہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے کوئی آثار نہیں کہ وہ یہ چیلنج قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ بس امید ہی کی جا سکتی ہے۔

صرف ترکی نے باقاعدہ دین اور سیاست (state) کی جدائی کو قانوناً نافذ کیا ہے۔ اس کا دستور اور قوانین اعلان کرتے ہیں کہ وہ لادین ریاست ہے۔ لیکن یقیناً بہت سے عملی حوالوں سے اسلام اب بھی ترکی کے نظامِ سیاست میں اور ترکی کے احساس شناخت میں ایک اہم اور اثر پذیر عامل ہے۔

اصولاً تدریجی اور غیر جابرانہ تبدیلی، اچانک اور زبردستی کی اصلاح سے بہتر ہے۔ جمہوریت، سمندری جھاگ میں سے ابھرنے والی محبت کی دیوی (Aphrodite) کی طرح اچانک پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ درجہ بدرجہ ہی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور اردن میں، جہاں ایک عمومی جمہوری سمت میں ارتقا ہو رہا ہے، امکانات بہت زیادہ ہیں۔ عراق اور شام میں اگر موجود آمروں کا تختہ الٹ بھی دیا جائے تو فوری قابل عمل جمہوریت کا امکان نظر نہیں آتا۔ نئی تبدیلی سے زیادہ سے زیادہ اتنی ہی امید کی جا سکتی ہے کہ وہ نسبتاً کم جابرانہ آمریت پر منتج ہو، جو آگے چل کر ممکن ہے مصر اور اردن کی طرح کی اصلاح یافتہ شخصی حکومتوں کا روپ اختیار کر لے۔ وہ جمہوریت تو نہیں ہوگی، ہاں آگے کی جانب ایک عظیم پیش رفت ضرور

ٹھہرے گی۔

جمہوریت کے حوالے سے بہترین امکانات ان جگہوں پر ہیں جہاں آزاد اداروں کی سمت میں تدریجی تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ جمہوریت، عام طور پر آزادی کے لیے تحریک کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ مغرب کی آزاد جمہوریتیں بھی اچانک سامنے نہیں آ گئی تھیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں [کالوں کی] غلامی کی تاریخ پر نگاہ ڈال لی جائے، یا زیادہ تر مغربی یورپ میں خواتین کے حق استصواب سے محرومی کو دیکھ لیں، معلوم ہو جائے گا کہ موافق حالات کے ہوتے ہوئے بھی جمہوریت کا ارتقا وقت اور جدوجہد کا متقاضی ہے اور یہ جنگ بڑی قربانیاں دے کر جیتی جاتی ہے۔

سامراجی قوتوں نے بیشتر اسلامی ملکوں کو اقتدار سے محروم کیا، اس لیے وہاں پہلا مطالبہ [بیرونی قبضے سے] آزادی کا ہوا۔ بیرونی اقتدار اور غاصبانہ حکومت ہم معنی تھے جنہیں ہر ممکن ذریعے سے ختم کرنا تھا۔ لیکن غصب واستبداد (tyranny) کے معانی مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہیں۔ روایتی اسلامی نظام میں غصب یا ظلم کے مقابل عدل ہے جبکہ مغربی سیاسی فکر میں اس کا جواب آزادی ہے۔ آج آ کر بہت سے اسلامی ممالک پر یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ انہوں نے [سیاسی] آزادی تو حاصل کر لی، لیکن وہ عدل اور [حقیقی] آزادی سے ابھی محروم ہیں۔ چند ممالک ایسے ہیں ـــ اور شاید جلد ہی بہت سے اور بھی ان میں شامل ہو جائیں ـــ جن کے خیال میں جمہوریت ان دونوں [حقوق] کے حصول کا یقینی ذریعہ ہے۔

[Bernard Lewis, "Islam and Liberal Democracy: A Historical Overview", *Journal of Democracy* 7-2 (1996) 52-63.]